باسمہٖ تعالیٰ

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو (اقبالؒ)

دنیا نظامِ محمدیؐ کیلئے بیتاب ہے

عیدِ میلاد النبیؐ کی مبارک تقریب ——— منعقدہ ۱۴؍ مارچ ۱۹۷۶ء پر

پرویز صاحب کا

دل گداز اور حقیقت کشا خطاب

کتبہ۔ سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُنیا نظامِ محمدیؐ کیلئے بیتاب ہے

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینی انتہاست

عزیزانِ گرامی قدر ۔ سلام و رحمت!

یہ ہماری کس قدر خوش بختی ہے کہ ہمیں پھر ایک بار اُس تقریبِ مبارک و مسعود میں شرکت کا موقعہ ملا ہے جو وجہِ شرفِ انسانیت اور باعثِ نازشِ عالم ہے۔ مبداءِ فیض کی اِس کرم گستری پر ہم اس کی بارگاہ میں جتنے سجودِ تشکر و نیاز بھی ادا کریں، کم ہیں۔ اور پھر یہ حقیقت بھی کس قدر وجہِ شادابیِ قلب و نظر ہے کہ یہ تقریب اُس موسمِ بہار میں آتی ہے جس میں زندگی تازہ شادمانیوں کی نمود کا پیغام لئے ہر شجرِ کائنات سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے ــــ عیدِ میلادالنبیؐ کی تقریب اور بہار کا موسم۔ کیا حسین و جمیل ہے یہ امتزاج!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس تقریبِ سعید پر بارگاہِ رسالتمآبؐ میں میرے نذرانۂ عقیدت کا عنوان ہے ــــ دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے ــــ اس موضوع تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ایک رسول کا فریضۂ زندگی کیا ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں اسلام دین کی حیثیت سے نہیں، مذہب کی شکل میں مروج ہے، اس لئے عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ رسول بھی محض وعظ و نصیحت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اور لوگوں کو اخلاقی اصلاحات کی ترغیب دے کر اپنا فریضہ ادا کر جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول افرادِ معاشرہ کی اخلاقی تہذیب کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے لیکن یہ چیز مقصود بالذات نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک ارفع و اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی تھی۔ اور وہ مقصد ہوتا تھا انسانوں کی تمدنی، تہذیبی، ثقافتی عمرانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کرنا۔ غلط بنیادوں پر استوار ہر نظام کو منہدم کر کے اس کی جگہ وحی کی بنیادوں پر ایک جدید نظام کی عمارت استوار کرنا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعہ خطبات کے پانچویں خطبہ میں رسول کے اِس فریضہ کو بڑی جامعیت سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

فریضۂ رسالت

"محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں اِن جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے۔ نبی کے دل میں بیتاب ہوتی ہے اسی لئے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

میں اس وقت ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے اور جنہیں صوفی کے مقامات کہا جاتا ہے ان کی ماہیت کیا۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جس فریضۂ رسالت کی وضاحت کی ہے وہ کس قدر اہم ہے اور اس سے رسول، دیگر مصلحین، مبلغین اور واعظین سے کس قدر ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اِس عظیم فریضہ کو کس حسن و خوبی سے سرانجام دیا، کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ظہور نبویؐ کے وقت دنیائے انسانیت کی حالت کیا تھی؛ اس کے لئے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ایک غیر مسلم محقق کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ (DENNISON) ایک ممتاز مورخِ تہذیب ہے۔ اس نے اپنی کتاب EMOTION AS THE BASIS OF CIVILIZATION) میں اس زمانے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:-

اس وقت (ظہورِ اسلام کے وقت) ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشید جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے

قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے انداز کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین دوسائر کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے ندیاں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

اور اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ۔

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ امر موجبِ حیرت و استعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمینِ عرب سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

علامہ اقبالؒ نے عالمِ انسانیت کی اس حالت کو اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر

محدث دہلوی شاہ ولی اللہؒ نے اسی ضمن میں کہا ہے کہ۔

چونکہ ہمارے نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی و معاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضورؐ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا گیا۔ اور آپ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی ملوکیتوں کو برباد کرایا (جو ان ناہمواریوں کا سرچشمہ تھیں)

(تفہیماتِ الٰہیہ جلد اول ص [illegible])

یوں تو خدا کا ہر رسول اسی قسم کے انقلاب کا داعی ہوتا تھا لیکن حضراتِ انبیائے سابقہ اور حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں چونکہ آبادیاں محدود ہوتی تھیں اور وسائلِ مواصلات اور ذرائع رسل و رسائل عام نہیں تھے اس لئے ایک رسول کا دائرہ اثر و نفوذ ایک خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن حضورؐ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جو عصرِ قدیم اور دورِ حاضرہ کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ اب دنیا کی آبادیوں نے محدود نہیں رہنا تھا۔ انہیں پھیل کر ایک عالمگیر معاشرہ بن جانا تھا۔ اس لئے حضورؐ کی بعثت نہ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص تھی نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود۔ حضورؐ تمام نوعِ انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلۡ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ جَمِیۡعًا۔ (۷/۱۵۸) "اے رسولؐ! تم تمام نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسولؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا۔ (۳۴/۲۸) "اے رسولؐ! ہم نے تمہیں پوری کی پوری انسانیت کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے"۔ اس "پوری کی پوری" انسانیت سے مراد صرف حضورؐ کے زمانہ کا عالمِ انسانیت نہیں تھا بلکہ اس میں قیامت تک آنے والے انسان سب شامل تھے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے کہ ہم نے ان لوگوں کی طرف اپنا رسول بھیجا جن کی طرف پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا (یعنی اہلِ عرب)۔ لیکن یہ صرف انہی کی طرف رسول نہیں تھا۔ یہ اُن کی طرف بھی رسول تھا وَّاٰخَرِیۡنَ مِنۡهُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ (۶۲/۳) "جو ان کے بعد آنے والے تھے"۔ ظاہر ہے کہ ان کے بعد آنے والوں میں تمام دنیا کے قیامت تک کے انسان شامل تھے۔

یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں خدا کے متعلق کہا کہ وہ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (۱/۱) ہے۔ اس کی کتاب کے متعلق کہا کہ وہ ذِكۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ (۶/۹۰) ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ آپؐ رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (۲۱/۱۰۷) ہیں۔ اور اس کی شہادت یہ کہہ کر دی کہ جو کتاب اس رسولؐ کی طرف بھیجی گئی ہے وہ وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۵) "ہر طرح سے مکمل ہے۔ آخری کتاب ہے۔ غیر متبدل ہے۔ اور اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کر سکتا"۔ یہ اس کتاب کی خصوصیت تھی۔ اور جو انقلاب اس کتاب کی رُو سے برپا ہونا تھا اس کی عالمگیریت کی طرف یہ کہہ اشارہ کر دیا کہ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ۔ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ۔ (۶۱/۹) "اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور مبنی برحقیقت نظام دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام دیگر تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو متفرق نظاموں کے تحت رہنا چاہتے ہیں۔ خدائے واحد کے نظامِ واحد کو پسند نہیں کرتے"۔

انقلابِ محمدی

اس انقلاب کی وسعت حدود نا آشنا تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا آغاز بہرحال اُس خطۂ زمین سے ہونا تھا جس میں حضورؐ کی بعثت ہوئی تھی۔

اس انقلاب سے وہاں کس قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اس کے متعلق بھی ہم غیر مسلم منکرین کی شہادات پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ (PRINGLE KENNEDY) ہمارے دور کا ایک مشہور فلاسفر ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> چند ہی سال کے عرصہ میں یہ نقشہ کس طرح بدل گیا کس طرح ۶۵۰ء تک یہ دنیا اس دنیا سے یکسر مختلف ہو گئی جو اس سے پہلے تھی۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔

(ARABIAN SOCIETY AT THE TIME OF MUHAMMAD. P.18)

کارلائل اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے:۔

> عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی۔ عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریگزار میں پھرتی تھی، ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں متبدل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس گزر چکے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی و تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک حصہ پر مسلط ہیں (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا) ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنیوالی بن گئی۔
>
> وہ عرب — یہ محمد — اور ایک سو سال کا عرصہ!
>
> کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادے میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے۔
>
> نوعِ انسانی خشک نیستان کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

(HEROES AND HERO WORSHIP. P. 66)

ممتاز تاریخ دان گبن اس باب میں کہتا ہے:۔

محمد کا مذہب شک وابہام سے بالکل بری ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت۔ محمدِ عربی نے بتوں، انسانوں اور اجرام سماوی کی پرستش کو اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر رد کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولے نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا، خالقِ کائنات کی صورت میں، اس لاانتہا ذاتِ سرمدی کا استقرار کر کے اسے مرکزِ حمد و ستائش قرار دے دیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے، اور جس کے سرچشمہ سے عقل و اخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلک توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہ حیرت ہے وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں، بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمدِ عربی نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر کندہ کیا تھا، اور جو ان بارہ صدیوں کے انقلاب کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کی عام انسانی حواس و تخیل کی سطح پر اترنے نہیں دیا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصور کبھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کر سکا۔ اس کی زندہ تعلیمات نے اس کے متبعین کے جذباتِ عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

(GIBBON — DECLINE & FALL OF ROMAN EMPIRE P.P. 287 & 353)

اور بریفا کہتا ہے کہ۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی، بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوتا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ اُدھر روما کی تہذیب، گرتے گرتے، بربریت کی حد تک

پہنچ چکی تھی، اور اِدھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب و ذہنی تحریکات کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی تھی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے آشنا ہوئی...... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء ـــ سائنس کی روح! ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا! نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا، درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (PRE - SCIENTIFIC AGE) ہے۔ پندرھویں صدی تک یورپ اپنی علوم و فنون کو اپنا تا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا...... جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ "چمن" نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔

(BRIFFAULT - MAKING OF HUMANITY)

ہم چاہتے تو اس باب میں اس قسم کی بیسیوں اور شہادات بھی پیش کی جا سکتی تھیں لیکن ہم سردست انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں خود اپنے زمانہ کی طرف آنا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ دنیا اُس نظام کے احیاء کے لئے کس قدر تڑپ رہی ہے جو سرزمینِ عرب میں قائم ہوا تھا۔

حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس عظیم انقلاب کی بنیاد رکھی گئی اور حضورؐ کے سچے جانشینوں نے اس عمارت کو استوار کیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے اپنی مساعی کا رُخ

اس کے بعد؟

دوسری طرف موڑ دیا جس سے دین مذہب میں بدل گیا اور اس انقلاب کی وہ شکل بھی باقی نہ رہی۔ میں اس حقیقت کو بار بار وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ نظامِ خداوندی جن قوانین کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے وہ ازلی اور ابدی ہیں اور فطرت کے قوانین کی طرح ہر وقت کار فرما رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس وقت کوئی ایسی جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کا

تہیہ کرتی ہے، وہ قوانین چند دنوں میں محسوس نظام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی جماعت باقی نہیں رہتی تو پھر وہ اپنی رفتار سے غیر محسوس طور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ ان قوانین کے اپنی رفتار سے کارفرما رہنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی فکر اور عقل سے اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین اور متشکل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ نظام وجہ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ اُسے چھوڑتا ہے اور کوئی دوسرا نظام وضع کرتا ہے۔ انہی تجرباتی طریقوں سے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب وہ کسی نظام کو کسی حد تک بھی اپنے لئے قابلِ اطمینان پاتا ہے تو اس نظام کا رُخ اسی منزل کی طرف ہوتا ہے جسے قرآن کریم نے عالمگیر انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایک ہمہ گیر شورش برپا ہے۔ انسانوں نے اپنے تجرباتی طریق کی رُو سے صدیوں کی منازل طے کرنے کے بعد اس وقت جو نظام وضع کئے ہیں وہ انہیں قابلِ اطمینان نہیں پا رہا اور کسی ایسے نظام کے لئے تڑپ رہا ہے جو اُس کے لئے وجہ سکون اور باعثِ فلاح و فوز بن سکے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس وقت دنیا میں جو اہم بنیادی نظام مروج ہیں، کیا انہیں اقوامِ عالم نے اطمینان بخش پایا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو قرآن کے ذہن میں اُس نظام کا تصور کس قسم کا ہے جو اُن کے نزدیک وجہ طمانیت بن سکتا ہے۔

(۲)

نظامِ حکومت

جو نظام قرآن کریم کی رُو سے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا اس کی بنیاد اس اہم حقیقت پر تھی کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کر سکے۔ — خواہ وہ حکومت لاقانونیت کی رو سے ہو یا انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ وہ ان دونوں شکلوں کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے اُس نے اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ. وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اُسے ضابطۂ قوانین یا نظامِ اقتدار حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، میرے محکوم، مطیع اور فرمانبردار بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تمہیں اس کتاب خداوندی کے مطابق، جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور اس پر غور و فکر کرتے رہتے ہو، خدا کے محکوم بن جانا چاہیئے۔

اس آیہ جلیلہ میں نظری طور پر ہی نہیں کہا گیا کہ تم خدا کے محکوم بن جاؤ، اس کا عملی طریقہ بھی بتا دیا اور وہ یہ کہ خدا کے محکوم بننے سے مراد یہ ہے کہ تم اس کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرو۔ (دیکھئے ۵: ۴۴-۴۸)۔ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کو ـــ خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت ـــ قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہے نہ کہ خود قوانین وضع کرنا۔ یہ تھا وہ عملی طریق جس سے قرآن کریم نے نوعِ انسان کو صحیح آزادی کا منشور دیا۔ صدرِ اول کے بعد یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور انسانوں نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے اپنے لئے نظامِ حکومت خود وضع کرنا شروع کر دیا۔ صدیوں کے تجربات کے بعد اب وہ اس نظام تک پہنچے ہیں جسے سیکولر نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عملی ذریعہ مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے۔

جمہوری نظام

سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام اطمینان بخش ثابت ہوا ہے۔ اس کے لئے خود مغربی مفکرین کی آراء ملاحظہ فرمایئے۔ (مثلاً فرانسیسی مفکر (RENE - GUINN) لکھتا ہے۔

> اگر لفظِ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی ..... ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا۔

(CRISIS OF THE MODERN WORLD)

جمہوری نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اکثریت کے فیصلے حق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس باب میں پروفیسر ایلفرڈ کوبن لکھتا ہے کہ:-

> یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں[1]

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے؟ اس کے لئے خود مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہی نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ان کے فیصلے ہر حالت میں صحیح نہیں ہو سکتے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے ایک مشہور کتاب لکھی ہے (SOVEREIGNTY)۔ وہ اس میں کہتا ہے کہ :-

> بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظام ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اُسے یکساں حق مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔ (ص ۱۹۹)

اسی حقیقت کو امریکی ماہر آئین ایڈورڈ کارون اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:-

> حقیقی قانون، مبنی بر حکومت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے نہ ہی ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے...... نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے (ص ۱)

یہ اقدار و قوانین کہاں سے ملیں گے اس کے متعلق ہمارے دور کا سب سے بڑا سائنس دان آئن سٹائن کہتا ہے کہ :-

> یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی" لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی انہیں ہیں

جو تجربہ سے درست ثابت ہو ۔

(۰)

نظامِ عدل

حکومت کا بنیادی منصب نظامِ عدل کا قیام ہے۔ قانون کی دنیا میں عدل سے مراد ہوتا ہے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ قوانین ہی حق پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلوں کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسانوں کو قوانین وضع کرنے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلے عدل کہلا ہی نہیں سکتے۔ صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے عدل کہلا سکتے ہیں۔ (EMIL — BRUNNER) ہمارے دور کا بہت بڑا فلسفۂ قانون کا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج کے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔
>
> (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

آپ نے غور فرمایا کہ عصرِ حاضر کا انسان اپنے وضع کردہ نظامِ حکومت کے ہاتھوں کس قدر تنگ آچکا ہے اس کے نزدیک وہی نظامِ حکومت موجبِ اطمینان اور مبنی بر صداقت کہلا سکتا ہے جو قوانین خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہو۔ وہ ان قوانین کی تلاش میں بُری طرح سرگرداں پھر رہا ہے۔

(۰)

نیشنلزم

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کیا کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (۲/۲۱۳) "یہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے"۔ اس لئے اسے مختلف قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا جہنم کی تباہی لانے کے مرادف ہے۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کے مطابق ایک ایسی امت

تشکیل فرمائی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی انسانوں کی خود ساختہ حدود و امتیازات کو مٹا کر نظریہ کی وحدت کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی مبنی برحقیقت شکل تھی اور اس کا نتیجہ وہ جنت جو یک رنگ و ہم آہنگ انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتی ہے۔ لوگوں نے اس تصور کو فراموش کر کے نیشنلزم کا نظریہ وضع کیا۔ اسے عمل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے تباہ کن نتائج کے ہاتھوں مغربی مفکرین چیخ اٹھے ہیں۔ (مثلاً) پروفیسر میٹین اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے:

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ:

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (دلچسپ تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

(THE HOPES FOR A CHANGING WORLD.)

وہ اس کے بجائے کس قسم کا نظام چاہتے ہیں اس کے متعلق بھی انہوں نے اب بڑی وضاحت سے کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری (TEILARD - DE - CHARDIN) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (BUILDING OF THE EARTH) میں لکھتا ہے:

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگنائیوں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (HUGH MILLER) اپنی کتاب میں، جس کا نام ہی اس نے (THE COMMUNITY OF MAN) رکھا ہے، لکھتا ہے:

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیا کرے جو انسانی زندگی کی ابتدا میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں، اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوع انسان پر مشتمل ہو۔

(GUNNER MYRDAL) سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہو گی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصول مسرت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ :-

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

(BEYOND THE WELFARE STATE)

مشہور امریکی مفکر (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ "تہذیب درحقیقت اس عمل پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا اور اس میں بسنے والی ایک انسانی برادری کی تشکیل کرے۔" وہ آگے چل کر لکھتا ہے۔

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی انداز معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدن بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے .... اب دنیا کو ایک ایسے بطل جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشو و نما کے راستے میں بری طرح حائل ہو رہی ہیں ـــــ اس بطل جلیل کی ضرورت جو کاروان انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدت انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔

(TRANSFORMATION OF MAN)

اگر ان مفکرین کے سامنے اسلام کی صحیح تاریخ ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ وہ بطلِ جلیل جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جا سکتا ہے، چودہ سو سال ہوئے نبی آخر الزماں کی شکل میں دنیا میں آیا تھا اور اس نے اس وحدت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا تھا۔ وہ بطلِ جلیل آج اپنے انسانی پیکر میں دنیا میں موجود نہیں لیکن وہ ضابطۂ حیات، جس کے مطابق اس نے اس وحدت کو قائم کیا تھا لفظاً لفظاً دنیا میں موجود ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم عالمگیر انسانیت کی وحدت چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔

———— (٠) ————

معاشی نظام

ہمارے دور کو دورِ اقتصادیات (AGE OF ECONOMICS) کہا جاتا ہے۔ اس دور میں انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے کمیونزم یا سوشلزم جیسا اقتصادی نظام وضع کیا ہے۔ اس نظام کے اسقام و نقائص کے متعلق میں اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اس وقت اس کے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا — جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے — اس میں میں نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ خود مارکس نے اپنے تصور کے نظام کے عملاً متشکل کرنے کے لئے کس طرح اپنے عجز کا اظہار کیا۔ اور اس کے بعد میں نے یہ لکھا ہے کہ اس کے تصور کا نظام، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح متشکل کر کے دکھا دیا تھا۔ اور وہ آج بھی قرآن کی روشنی میں کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت صرف ایک نکتہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کو واشگاف الفاظ میں یہ وارننگ دی تھی کہ اگر تم نے اس نظام کو نہ بدلا تو ایک وقت آئے گا جب یہ بے مایہ، مفلس، نادار، محنت کش تنگ آکر تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔ اسے حضورؐ نے ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ:-

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصہ میں رہے۔ جو نچلے حصہ میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا، ہم نیچے کشتی میں سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

حضورؐ نے سرمایہ داروں کو یہ وارننگ چودہ سو سال پیشتر دی تھی۔ آپ دیکھئے کہ آج یہ کس طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے شہرۂ آفاق مجلہ (TIME) نے اپنی ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا ــــ کرۂ ارض کا ایک نیا تصادم ــــ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کے قریب ۷۵ کروڑ باشندے ساری دنیا کے ذخائر کو غصب اور ہضم کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اور اس زمین کی قریب ایک سو مملکتوں میں بسنے والے دو ارب باشندے پر وقت موت کے سائے تلے سسکیاں لے رہے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تو اس وقت کی حالت ہے۔ لیکن ہم جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں ہر روز قریب بیس لاکھ انسانوں کا اضافہ ہو رہا ہے تو سوچئے کہ چند سالوں کے بعد یہاں کس قسم کی قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس قیامتِ صغریٰ کی کیفیات کو اس نے صرف چار الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ "یہ مسئلہ نسلِ انسانی کے لئے ٹائم بم کی حیثیت رکھتا ہے"

دیر صرف اس مہلت کے وقفہ کی ہے۔ جب یہ اپنے وقت پر پھٹا تو یہ پوری نسلِ انسانی کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اسی آنے والی تباہی کے پیشِ نظر پچھلے دنوں ستر کے قریب ترقی پذیر (UN-DEVELOPED) ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ فلپائن کا پریذیڈنٹ اس کا چیئرمین تھا۔ اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترقی یافتہ (DEVELOPED) مملکتوں کو وارننگ دی کہ اگر تم ان پسماندہ ممالک کو جلد از جلد اپنے ہمدوش نہ لے آئے تو یہ خود تو تباہ ہوں گے ہی، لیکن اپنے ساتھ تم سب کو بھی تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ آپ غور کیجئے عزیزانِ من! کہ وہ تباہی جس کے متعلق نوعِ انسان کے محسنِ اعظمؐ نے چودہ سو سال پہلے وارننگ دی تھی کس قدر حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے انسانی فکر نے سوشلزم کا نظام وضع کیا تھا۔ اس نظام کی کیفیت یہ ہے کہ ــــ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے ــــ وہ ابھی چار قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ لڑکھڑانے لگ گیا۔ روس میں تو وہ ناکام ہو چکا ہے۔ اسی ہفتہ خبر آئی ہے کہ وہاں کا نظامِ زراعت اس بری طرح ناکام ہو رہا ہے کہ وہاں کی مرکزی کمیٹی نے جھنجھلا کر وزیرِ زراعت کو الگ کر دیا ہے اور ایسا دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہے۔ چین کے متعلق میں نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ اس کی ترقی کا راز ماؤزے تنگ کی شخصیت ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ اس کا بھی کس طرح شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ وہاں یہ انتشار چو این لائی کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا ہے حالانکہ ماؤزے تنگ ابھی زندہ ہے۔ عزیزانِ من! جو نظام بھی شخصیات کے سہارے قائم ہوتا ہے اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی سکت نہیں ہوتی۔ نظام وہی قائم رہ سکتا ہے جو غیر متبدل اقدار کی محکم بنیادوں پر استوار ہو۔

—— (۰) ——

مذاہبِ عالم

دنیا کے مختلف مذاہب کے علمبردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہو رہی ہیں۔ مذہب کے ان علمبرداروں میں خود ہم مسلمان بھی شامل ہیں کیونکہ ہمارے ہاں بھی وہ دین موجود نہیں جسے خدا نے مقرر کیا۔ اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ ہمارے ہاں بھی اسلام بحیثیت ایک مذہب ہی کے رائج ہے۔ آج مذاہب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا نقشہ پروفیسر (HOCKING) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آ سکتی) ان کے عقاید و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

(LIVING RELIGIONS AND A WORLD FAITH.)

دنیا جس طرح اپنے وضع کردہ نظامہائے حیات سے تنگ آ چکی ہے اسی طرح موجودہ مذاہب سے بھی مایوس ہو چکی ہے — کاغذ کے پھولوں سے کوئی کب تک اپنا جی بہلا تا ہے؟ بایں ہمہ وہ اپنی نجات کا ذریعہ مذہب ہی سمجھتی ہے۔ اس کے لئے انہیں کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے، اس کا تصور امریکہ کے ممتاز ماہرِ نفسیات (ERICH FROMM) نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ مذہب —

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ ایسی نظام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب

بن سکے۔

(THE SANE SOCIETY)

چونکہ اہلِ مغرب کے ہاں دین کا تصور نہیں، اس لئے ان کی زبان میں دین کی قرآنی اصطلاح کے ترجمہ کے لئے بھی کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغرب کے دانشوروں کو "دین" کی تلاش ہے، مذہب کی نہیں (وہ تو پہلے ہی مذہب گزیدہ ہیں اور جیسے مذہب کا بنجارہ خود اپنا ٹھاٹھ باٹھ سمیٹ کر رخصت ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ جو اس وقت اس کا دھوم دھڑکا سنائی دے رہا ہے، وہ رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں) لیکن اپنی زبان کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے وہ اسے (RELIGION) ہی سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ خود ہمارے ہاں بھی دین کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے ہم بھی اسلام کو ایک مذہب ہی

مناظرے اور مباحثے

کی حیثیت سے سمجھتے اور اسی حیثیت سے اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ دیگر اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کر دی جائے اور اپنی ان فتح مندیوں پر جشنِ مسرت منائے جائیں۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے، ہمارے ہاں ایک شخص ـــ مرزا غلام احمد قادیانی ـــ نے مامور من اللہ ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اور اس ماموریت کا مقصد یہ بتایا کہ وہ آریوں اور عیسائیوں سے مباحثے کر کے اسلام کی افضلیت ثابت کرے گا۔ عیسائی پادریوں کو شکست دینے کے لئے اس نے نظریہ یہ پیش کیا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ اپنے اس کارنامے کو اس نے کسرِ صلیب (صلیب توڑ دینے) سے تعبیر کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ کاسرِ صلیب ہونے کے مدعی تھے اور دوسری طرف اُسی صلیب کی محافظ سلطنتِ برطانیہ کی اطاعت کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی ان ظفر مندیوں کا ڈنکا بجاتے، دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اس کے چند ہی سال بعد پہلی جنگِ عظیم میں صلیب پرستوں نے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حشمت کا بھی تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے امتِ مسلمہ کو مذہب پرستی کے اس مقدس فریب سے نجات دلانے کے لئے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصور پیش کیا تھا

مملکتِ پاکستان میں مذہبیت

تاکہ اس میں پھر سے اسلام کو ایک دین (نظامِ حیات) کی حیثیت سے پیش کر کے، اقوامِ عالم کے اختیار کردہ دیگر نظاموں پر اس کی افضلیت ثابت کر دی جائے۔ لیکن وا حسرتا! کہ ان کے اس خواب کو مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری اور ہمارے حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار نے خواب پریشاں کر کے رکھ دیا۔ اور دین کے احیاء کے بجائے یہاں مذہب نے اپنا جال اور بھی شدت اور وسعت سے پھیلا دیا۔ حتےٰ کہ اب یہ پھندے اپنی انتہا تک پہنچ رہے ہیں۔ مذہب کا مقصود انفرادی جذبات کی تسکین ہوتا ہے جسے "ثواب" کے غلط مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کس طرح جذبات کی تسکین کا سامان بہم

پہنچاتا ہے اس کی تازہ ترین مثالیں ہمیں دو ایک حالیہ واقعات سے ملتی ہیں۔ اگلے دنوں پاکستان میں مسجد نبوی کے امام تشریف لائے۔ انہوں نے لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ پڑھائی تو کم از کم پانچ لاکھ افراد نے اُن کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں جمعہ کی نماز کا اتنا بڑا اجتماع اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ بات بھی قابلِ فہم۔ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اطہر سے ہماری عقیدت ہی نہیں، محبت کا تقاضا ہے کہ جس چیز کی حضورؐ کی طرف کسی انداز سے بھی نسبت ہو، وہ ہمارے نزدیک محبوب اور محترم بن جائے۔ ہم تو مکہ اور مدینہ طیبہ کی کھجوروں اور گٹھلیوں کو بھی یونہی نہیں پھینک دیتے۔ انہیں بھی زمین میں دفن کر دیتے ہیں کہ پامالی سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ مسجد نبوی کے یہ امام مسلکِ اہلِ حدیث کے پابند ہیں اور اس باب میں نجدی آلِ سعود کی شدت کا سب کو علم ہے۔ ان کے عقیدہ کی رُو سے مزارات پر گنبد اور قبے تعمیر کرنا تو ایک طرف، وہ زمین سے ذرا سی اٹھی ہوئی پختہ قبر کو بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسی مسلک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جنت البقیع میں صحابہ کبارؓ تک کے مزارات کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ (ان امام صاحب نے تو معلوم نہیں اس باب میں کچھ ارشاد فرمایا تھا یا نہیں۔ ان کے بعد مسجد حرام (کعبہ) کے امام تشریف لائے تو انہوں نے اسی شاہی مسجد میں اپنے خطبہ جمعہ میں "قبروں کو پوجنے یا ان سے کچھ مانگنے کے رجحانات کو سراسر کفر قرار دیا" (نوائے وقت لاہور۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء)۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس پانچ لاکھ کے مجمع نے اس مسلک کے پابند امام کے پیچھے نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کر لی، اور اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر سیدھے متبرک سے اُس پار داتا گنج بخش علیہ الرحمتہ کے مزار پر حاضری کے لئے جمع ہو گئے جہاں ان کے عرس کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس تقریب میں مزار پر فاتحہ ہی نہیں پڑھی جاتی، اُسے گلاب اور کیوڑے سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں، منتیں مانی جاتی ہیں، سجدے کئے جاتے ہیں۔ پھر قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ اُنہی مسلمانوں نے جنہوں نے اس امام کے پیچھے، جو ان تمام بدعات کو کفر اور شرک سمجھتا تھا، نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا (یقیناً ثواب حاصل کیا تھا)، داتا صاحب کے عرس کی ان رسومات میں شریک ہو کر بھی اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا۔ مذہب میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ جس حکومت کے زیرِ اہتمام شاہی مسجد کا اجتماع منعقد ہوا تھا اُسی کے زیرِ انتظام عرس کی یہ تقریبات بھی سر انجام پا رہی تھیں۔ کیونکہ امورِ مذہبی اور اوقاف دونوں حکومتِ پاکستان کے زیرِ تحویل ہیں ــــ ان دونوں سے آگے بڑھ کر تیجے اس اضافہ کی اجازت بھی دیجئے کہ اسی شام جناح باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں روسی طائفہ کے ناچ گانے کا تماشہ بھی ہوا اور عجب نہیں کہ مملکت کے کسی وزیر نے اس کا بھی افتتاح کیا ہو۔ یہ سب کچھ اُس مملکت میں ہوا اور ہو رہا ہے جس کے آئین میں اسلام کو مملکت کا "مذہب" قرار دیا گیا ہے۔ اگر مملکت کا مذہب نہیں ــــ دینِ اسلام ہوتا تو اس میں اس قسم کی بو العجبیوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی تھی؟

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مذہب میں دین، وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثالوں کی بھی کچھ کمی نہیں۔

اسلام وعظ بن گیا

آپ حضرات میں (نوجوانوں کو چھوڑیئے) جو ذرا عمر رسیدہ ہیں وہ اگر اپنے حافظہ پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا کہ وہ بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے تو ان پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہ آسکے۔ یہ وعظ مسجدوں اور اسٹیجوں سے بڑھتے بڑھتے عالمگیر اجتماعات تک آپہنچے۔ دو سال قبل اسی لاہور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہر مملکت کے نمائندہ نے مسلمانوں کے اتحاد اور امت کی وحدت پر خطبات دیئے۔ قرار دادیں پاس ہوئیں اور اس کے بعد یہ تمام سربراہ اسی طرح متفرق اور منتشر ہو گئے جس طرح اس کانفرنس میں شرکت سے پہلے تھے۔ اب اسی شان و شوکت سے سیرت کانگریس منعقد ہو رہی ہے جس میں مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے قریب ایک سو ممتاز مندوب شرکت فرما رہے ہیں۔ اس میں بھی ہر ایک کے خطاب کا مقطع کا بند یہ سنائی دیتا ہے کہ "رسولِ اکرمؐ نے چودہ سو برس قبل عالمی انسانی برادری کا جو تصور دیا تھا اگر آج دنیا بھر کے مسلمان اس پر عمل کریں تو مسلمان قوم پوری دنیا پر حاوی ہو سکتی ہے۔" (امام مسجد الحرام کا خطبۂ جمعہ۔ بحوالہ نوائے وقت لاہور ۶ مارچ ۱۹۷۶ء)۔ سیرت کانگریس کے اجتماعات میں حسبِ معمول نہ صرف غلبۂ اسلام کے لئے دعائیں مانگی گئیں بلکہ مرکزی حکومتِ پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے یہ اعلان بھی فرما دیا کہ:-

> ۱۹۷۶ء کا سال پاکستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل[1] ہے۔ بلکہ یہ سال غلبۂ اسلام کا سال ہے۔ اور اس سال عالمِ اسلام کو کامل اتحاد نصیب ہوگا۔ اس سال باطل کی تمام قوتیں انشاء اللہ شکست کھائیں گی[2]۔
>
> (نوائے وقت لاہور۔ ۶ مارچ ۱۹۷۶ء)

اس پر یقیناً نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے ہوں گے۔ اور جن کے گوش نصیحت نیوش ہوں گے، انہوں نے، مسجد سے ملحق مزارِ اقبالؒ سے اٹھتی ہوئی یہ دردناک صدا بھی سن لی ہوگی کہ ؎

"مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اُنہیں
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اُنہیں"

ٹوئن بی کا انتباہ

ہم (دعاوی بلا تائید) مذہب کے برگِ حشیش کے رسیا، اس قسم کے سنہرے خوابوں میں مدہوش رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ دانشور، جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں، دیکھئے کہ وہ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی عصرِ حاضر کا سب سے بڑا نامور مورخ ہے۔ وہ نیشنلزم پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

---

[1] یہ تو قابلِ فہم ہے۔
[2] ان پیش گوئیوں نے میرزا غلام احمد کی یاد تازہ کرا دی۔

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلا لحاظ اختلاف نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں۔ ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے .... مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے، جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن، یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودت و اخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے ایک عالمگیر برادری کا تصور، ویسے تو فلاحِ انسانی کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

(THE WORLD AND THE WEST)

دانشورانِ مغرب تو ہم سے یہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ کوئی مسلم مملکت اپنی جداگانہ قومیت کو چھوڑ کر، وحدتِ امت کی طرف ایک قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ ویسے، وعظ ان سے جتنے جی چاہے کرا لو۔

میرے ہاں عزیزانِ من! مغرب کے اکثر مفکرین و مصنفین آتے رہتے ہیں۔ میں اُن کے سامنے اسلامی نظام کے اساسی عناصر بھی پیش کرتا ہوں تو وہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں ان نظریات کے قابلِ قبول

ہونے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارے اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ مسلمان ان نظریات کو

ایک سوال؟

اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ سارے عالمِ اسلام میں نہیں کسی ایک مسلم ملک میں بھی یہ نظام عملاً قائم ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو فرمائیے کہ جب آپ اس نظام کو خود اپنے ہاں قائم نہیں کرتے یا قائم نہیں کر سکتے تو دنیا کو اس کی دعوت کس منہ سے دے سکتے ہیں؟ میں تو ایک طرف، ان کے اس سوال کا جواب نہ ہماری سربراہی کانفرنس دے سکتی تھی نہ سیرت کانگریس۔ نہ ہی وہ حکومت جس کے زیرِ اہتمام اس قسم کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب کیا دے سکیں گے جو خود اپنی مملکت میں بھی ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں بن سکے! عزیزانِ گرامی قدر! یاد رکھئے کسی نظریہ کو محض وعظ و نصیحت کے ذریعے نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اُسے اگر عملی نظام کی شکل میں قائم کر دیا جائے تو اس کے خوشگوار نتائج دنیا کے لئے وجہِ کشش بن جاتے ہیں۔ خود حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک قرآنی نظریات کی تبلیغ فرمائی۔ اور اس کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ آپؐ کے مخاطبین میں سے کوئی بھی ان نظریات کو ماننا تو ایک طرف، پہچانتا تک نہیں تھا لیکن اس طریق سے تیرہ برس کے عرصہ میں ایک قلیل سی تعداد اسلام کی طرف آسکی۔ مگر جب اس کے بعد حضورؐ نے اپنے مخلص اور صادق متبعین کی رفاقت سے اسلام کو بہ حیثیت ایک دین کے قائم کر دیا تو چند سال کے عرصہ میں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کی عملی تصویر دنیا کے سامنے آگئی۔ اور پھر جب یہ نظام ذرا آگے بڑھا تو عہدِ فاروقیؓ میں وہ ایران سے مصر تک ایک بحرِ مواج بن گیا۔ یوں دنیا فوج در فوج، دین کے حصار میں داخل ہوئی۔ اب بھی اگر کسی ایک خطۂ زمین میں یہ نظام عملاً قائم ہو جائے تو آپ دیکھئے گا کہ اقوامِ عالم جو اپنے بنائے ہوئے نظاموں سے اس درجہ تنگ آچکی ہے، کس طرح لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر عقل کے تجرباتی طریق کی سست رفتاری سے ایسا ہو گا۔ اور نہ معلوم اس میں زمانہ کو اور کتنی کروٹیں بدلنا اور نوعِ انسان کو کس قدر ہولناک تباہیوں میں سے گزرنا پڑے۔ اس میں وقت تو صرف لگے گا لیکن انسانیت کو بالآخر یہ نظام اختیار کرنا پڑے گا کہ اس کے سوا اس کی فلاح و نجات کی کوئی شکل نہیں ہو گی۔ گوئٹے نے اپنے دوست (ECKERMANN) کے نام اپنے خط میں کس قدر صحیح لکھا تھا کہ:-

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی ہے حضورؐ کے نبی آخر الزمان ہونے کا مطلب اور ختمِ نبوت کا مفہوم۔ حضورؐ کی رسالت زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ دنیا کے آخری انسان کے لئے بھی حضورؐ ہی رسول ہیں۔ جو اس

حقیقت پر یقین نہیں رکھتا اور کسی دوسرے ظہور یا اس کے امکان کو تسلیم کرتا ہے وہ صاحبِ ختمِ نبوت پر اس کے ایمان کا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا شمار امتِ محمدیہ میں نہیں ہو سکتا۔ یہ میرا ایمان ہے میری جان کی قدر! اور اسی ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے کی میری آرزو ہے ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

(۰)

میں نے اسی قسم کے ایک اجتماع میں اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں نظامِ محمدی ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو کشتیٔ انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا مقامِ مرگ نہیں امیدوں کی نشیدِ حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائرِ پیش رس ہوتی ہے۔ وہ آخرِ شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشیدِ جہانتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہو گئی، اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت (LEADERSHIP) ہو گی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں امید جس کی وجہ سے میں ابھی تک جیتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ

ترے سوا کوئی شایانِ وفا بھی تو ہو!
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں؟

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳/۵۶)